© rasailojaraid.com

مظفر حسین

خودی اور آخرت

(۲)

خودی کے ثبات دوام کے قرآنی نظریہ کو سمجھنے کے لیے علامہ اقبالؒ تین باتوں کو بنیادی اور اصولی قرار دیتے ہیں جو مندرجۂ ذیل ہیں :

۱۔ خودی کا ظہور اگرچہ زمانے سے وابستہ ہے لیکن اس کا وجود زمانے سے متقدم نہیں۔

۲۔ یہ ناممکن ہے کہ مرنے کے بعد انسان اس کرۂ ارضی میں واپس آئے۔

۳۔ خودی کی متناہیت انسان کی بدبختی نہیں ہے۔

آخرت کے اس قرآنی نظریہ کی رو سے تناسخ اور وحدت الوجود کی کلی نفی ہو جاتی ہے۔ قرآن کے نظریۂ حیات بعد الموت کے مطابق انسان کی متناہی خودی جب خدا کی لامتناہی خودی کے سامنے حاضر ہوگی تو اپنی انفرادیت کو ساتھ لیے حاضر ہوگی تاکہ اپنی آنکھوں سے اپنے گزشتہ اعمال و افعال کو دیکھ کر اپنے مستقبل کا اندازہ کرسکے۔ قرآن کی رو سے انسان کی انتہائی مسرت اور سعادت یہ نہیں ہے کہ وہ اپنی متناہیت اور انفرادیت سے محروم ہو جائے بلکہ اس کے "اجرِ غیر ممنون" کا مطلب یہ ہے کہ اس کے ضبطِ نفس، اس کی یکتائی اور بحیثیت ایک خودی اس کی فعالیت زیادہ سے زیادہ شدت اختیار کرلے، یہاں تک کہ قیامت کی جانگسل ہولناکیاں بھی اس کے سکون و اطمینان میں خلل انداز نہ ہوسکیں[۱]۔

ثباتِ دوام کا یہ تصور وحدت الوجود کے اس تصور سے کس قدر مختلف ہے جس میں "عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا" کے مصداق انسان کا سکون و اطمینان اور اس کی نجات اس بات میں ہے کہ وہ اپنی خودی کو خدا کی خودی میں مدغم کردے۔ اس سلسلے میں وضاحت کے طور پر "اقبال کے حضور میں" سے ایک اقتباس نقل[۲] کیا جاتا ہے :

"عرض کیا: اگر عشق ہی اصول کائنات ہے تو خودی کی وہ کثرت جو عبارت ہے میک ٹیگرٹ کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"پسے ہوئے وجود" (PULVERISED BEING) سے بسبب عشق ایک دوسرے کی طرف کھنچیں گی تاآنکہ ایک دوسرے میں مدغم ہو جائیں۔ عشق کا تقاضا ہے جذب۔ اب اگر ایک ہمہ گیر خودی کا وجود مان لیا جائے تو یہ ماننا بھی لازم آئے گا کہ جو بھی خودی ہے اس میں جذب ہو جائے گی یعنی اپنا وجود کھو دیگی اور یہ کہتے کہتے نادانستہ امیر خسرو کا یہ شعر میری زبان پر آگیا: ؎

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تاکس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

میں نے عرض کیا عام ضرب المثل یہی ہے "دو قالب ایک جان"۔ حضرت علامہ نے فرمایا "ایک قالب دو جان کہا ہوتا تو زیادہ بہتر تھا"۔

ارشاد ہوا "بعض باتیں اظہارِ مطلب کے لیے کہی جاتی ہیں۔ ان کو منطقی دلائل پر محمول کرنا غلطی ہے۔ یہ درست ہے کہ خودی کا تقاضا ہے عشق۔ اس لیے عشق کے بغیر جسے میک ٹیگرٹ بھی اصولِ کائنات قرار دیتا ہے خودی میں استحکام پیدا نہیں ہوتا، لیکن اگر خودی میں استحکام پیدا کرنا مقصود ہے تو پھر اس کے فنا کا کوئی جواز نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جذبۂ عشق میں جب ہم فنا پر زور دیتے ہیں تو اس کا مطلب بجز اس کے اور کچھ نہیں ہوتا کہ ہماری توجہ صرف اس چیز پر ہے جو عشق کا مقصود ہے اور جس کی خاطر ہم سب کچھ بھول رہے ہیں لیکن یوں فنا کے اس عام تصور پر استدلال کرنا غلطی ہے۔ نفیٔ ذات —— اس کے معنی یہ ہیں کہ ہماری ہستی ہمارے مقصود سے ہے۔ یہ فنا تو عین بقا ہے۔ صوفیائے اسلام نے اسی لیے فنا کو بقا سے تعبیر کیا ہے"۔

اس لیے علامہ اقبالؒ کے نزدیک مذہبی مشاہدات اور واردات میں "انا الحق" (حلاج)، "انا الدہر" (حدیث)، "میں ہوں قرآن ناطق" (علی)، "ما اعظم شانی" (بایزیدؒ) کے اقوال میں قرب و اتصال کی جس کیفیت کا بیان ہے اس میں قرب و اتحاد کا مقصود یہ نہیں کہ لامتناہی خودی متناہی خودی کے آغوشِ محبت میں آجائے۔ انسان کی خودی نہ تو دوسری خودی میں مدغم ہوگی اور نہ ہی اس کا ظہور کسی دوسری خودی کے طور پر ہوگا۔ اسلامی نقطۂ نظر سے اللہ تعالیٰ کے قرب کی آرزو میں انسان کا منتہائے کمال "وصال" نہیں بلکہ "رضا" کا حصول ہے۔ قرآن پاک میں انسانیت کے بہترین نمونوں (یعنی صحابۂ کرامؓ) کی سیرت کے بیان میں ان کی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے "فضل" اور "رضا" کی تلاش میں سرگرم رہتے ہیں (یَبْتَغُوْنَ فَضْلاً مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانًا) پھر ان کے حصول کا کمال بھی یہی بیان کیا گیا ہے کہ اللہ اُن سے راضی اور وہ اللہ سے راضی (رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ)۔ اسی طرح قرآن پاک جب نفسِ مطمئنہ کی "رجعت الی رب" کا ذکر کرتا ہے تو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

معاً ساتھ ہی "راضیۃً مرضیۃً" اور "اُدخُلی فِی عِبادِی" کے الفاظ کے ساتھ اس بات کی وضاحت بھی کر دیتا ہے کہ انسان کا حصول کمال "رضا" اور "عبُودیت" کے سوا کچھ نہیں ہے۔

از جدائی گرچہ جاں آید بہ لب — وصلِ اُو کم جُو رضائے او طلب

اس لیے کمالِ انسانیت حصولِ مقامِ عبدیّت ہے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام عبدہٗ و رسولہٗ تھا اور معراجِ انسانیّت پر فائز المرام ہوتے ہوئے بھی آپؐ کی انتہائی آرزو، جو بوقتِ رحلت بصورتِ الفاظ آپؐ کی زبان حق ترجمان سے ادا ہوئی، وہ آرزوئے رفاقتِ باری تعالیٰ تھی نہ کہ وصال کی ایسی وحدت الوجودی کیفیت جس میں عبد و معبود کی دوئی مٹ جائے۔ مختلف احادیث میں یہ الفاظ جس طرح بیان کیے گئے ہیں ان میں معنوی اختلاف کی گنجائش بہت کم ہے۔ اگرچہ تھوڑا بہت لفظی فرق ضرور پایا جاتا ہے جیسا کہ درجِ ذیل کلمات سے ظاہر ہے جو احادیث میں سے لیے گئے ہیں[۴۵]:

اسئل اللہ الرفیق الاعلیٰ والاسعد

الحقنی بالرفیق، الحقنی بالرفیق

اللھم اغفرلی وارحمنی والحقنی فی الرفیق الاعلیٰ

بل الرفیق الاعلیٰ

اللھم فی الرفیق الاعلیٰ

اس میں شک نہیں ہے کہ قرآن حکیم میں لقائے رب کا مضمون بھی بکثرت بیان ہوا ہے اور آخرت میں دیدارِ الٰہی کی بشارت موجود ہے۔ قرب و بعد کے مضامین کا بھی ذکر ہے لیکن ان تمام بیانات میں کہیں بھی اتصال و اتحاد کی کسی ایسی کیفیت کا بیان نہیں ملتا جس میں "اللہ اللہ کُن کہ اللہ می شوی" کے انداز پہ انسان کی خودی کا خدا کی خودی میں مدغم یا گم ہو جانے کا اشارہ تک بھی پایا جاتا ہو۔ اس کے برعکس کیا دنیا اور کیا آخرت، خدا اور بندے کے تعلق کا ذکر قرآن حکیم نے جہاں جہاں بھی کیا ہے وہاں یہ تعلق دو خودیوں یا دو اناؤں کا ایسا تعلق ہے جس میں دونوں کی انفرادیت الگ الگ برقرار رہتی ہے۔ مثلاً

فاذکرونی اذکرکم

ادعونی استجب لکم

اجیب دعوۃ الداع اذا دعان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان تنصروا اللہ ینصرکم

یحبھم و یحبونہ

قُل اِن کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ

راضیۃ مرضیۃ

رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ

علامہ اقبالؒ نے اس اہم نکتے کے فلسفیانہ مضمرات کو جس خوبصورتی کے ساتھ شعر و نثر میں بیان کیا ہے وہ خاص انہی کا حصّہ ہے۔ اس تناظر میں حیات بعد الموت کے بارے میں آپ کی تصریحات فکری لحاظ سے بہت دُور رس اہمیت کی حامل ہیں۔ خودی کا پیغام ایک طرح سے وحدت الوجودی تصوّف کے خلاف ایک طرح کا اعلانِ جہاد تھا جس سے اسلام کے نام پر پھیلائی ہوئی گمراہیوں کا ازالہ ممکن ہوا۔ چنانچہ وہ خود ایک جگہ لکھتے ہیں "میری تمام تحریریں اس تعبیر (یعنی وحدت الوجود) کے خلاف ایک طرح کی بغاوت ہیں"۔ قرآن کی رُو سے حیات اور موت دونوں مخلوق ہیں اور کامیاب زندگی "احسن عملاً" کی زندگی ہے۔ خواہ یہ حُسنِ عمل زندہ رہنے سے ممکن ہو یا جان کو رضائے الٰہی کی خاطر قربان کر دینے سے ؎

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی　　ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی
تُو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ　　جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

یعنی خودی کا (جو اپنی حقیقت کی رُو سے مستور مگر عمل کی رُو سے ظاہر ہے) مقدر یہ ہے کہ موت و حیات کی ہر منزل میں اپنا عین قائم رکھے اور مدارجِ کمال طے کرتی رہے ؎

خودی اندر خودی گنجد محال است　　خودی را عینِ خود بودن کمال است

یعنی خدا اور انسان کا رشتہ ہرگز ایسا نہیں ہے کہ "جس تہ سے یہ موتی نکلا تھا اس تہ میں جا کر ڈوب گیا" کے مصداق جُزو کُل میں فنا کی نیند سو جائے بلکہ انسان تو بنایا ہی اس طرح سے گیا ہے کہ محبت اور عمل ہی اس کا مقدر ہیں۔ اقبالؒ کے نزدیک محبت میں "فراقِ عارف و معروف" خیر ہے، کیونکہ زندگی و پائندگی دردمندی ہی کی بدولت ممکن ہے اور جدائی عاشقوں کے لیے سازگار ہے ؎

جدائی خاک را بخشد نگاہے　　دہد سرمایۂ کوہے بکاہے
جدائی عشق را آئینہ دار است　　جدائی عاشقاں را سازگار است

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اگر ما زندہ ایم، از دردمندی　　　اگر پائندہ ایم، از دردمندی

لیکن محبت وہی معتبر ہے جو لازوال اور عمل انگیز ہو۔ جو کہیں نہ رکے، کبھی مدھم نہ پڑے بلکہ مسلسل مسافرت اور پیہم عمل پر اسے ابھارتی رہے ۔

محبت؟ در گرہ بستن مقامات　　　محبت؟ در گزشتن از نہایات
محبت ذوقِ انجامے ندارد　　　طلوعِ صبحِ اُو شامے ندارد
ہزاراں عالم افتد در رہِ ما　　　بپایاں کے رسد جولانگہ ما
مسافر جاوداں زی جاوداں میر　　　جہانے را کہ پیش آید فرا گیر
بہ بحرش گم شدن انجامِ ما نیست　　　اگر او را تو در گیری فنا نیست

خودی کی زندگی کے لیے احساسِ خودی اور عمل ناگزیر ہیں۔ روحانی ترقی کے لیے بلاشبہ خداشعوری کی اعلیٰ ترین کیفیت یعنی للّٰہیت یا محبت درکار ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ انسان خودشعوری کو کھو دے یا دوسرے لفظوں میں اُس کی خودی میں فنا ہو جائے۔ چنانچہ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں "روحانیت میں اسلامی تربیت کا طریقہ 'صحو' ہے 'سکر' نہیں"[۴۸]۔ اسی طرح ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کی زندگی اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ ایک مسلمان قلب کی منفصل کیفیت بیداری ہے نہ کہ خواب یا سکر۔ قرونِ اُولیٰ کے مسلمانوں میں تو کوئی مجذوب نظر نہیں آتا بلکہ ابتدائی اسلامی لٹریچر میں مجذوب کی اصطلاح بھی مثل دیگر اصطلاحات صوفیہ کے نہیں ملتی[۴۸]۔ علامہ اقبال کے پیشِ نظر "مقدمۃ القرآن" لکھنے کا جو منصوبہ تھا اور جسے حیطۂ تحریر میں لانے کی موت نے انہیں مہلت نہ دی اس کے خاکہ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی اس تصنیف میں وہ اس نکتہ کی پوری تفصیل کے ساتھ وضاحت کرنا چاہتے تھے۔ اس خاکہ میں نجات کے[۴۹] موضوع پر آپ کے دیئے گئے اشارات (نوٹ) بہت اہم ہیں جن کا منشا اسی حقیقت کو واضح کرنا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں نجات کا مفہوم یہ ہرگز نہیں ہے کہ شعور اور خودشعوری سے خلاصی پائی جائے (وجئتمونا فرادا ۹۰:۱۹) بلکہ نجات کا اسلامی تصور یہ ہے کہ خودی اس کائنات میں اپنی تنہائی سے نکل کر خدا کی رفاقت حاصل کر لے۔ (ھو معکم ۴:۵۷) والی رفیق الاعلیٰ (حدیث)۔ پھر اسی ضمن میں آپ نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ نیند، شراب اور رقص، شعور کے تناؤ کو مضمحل کرتے ہیں اور زمان و مکان سے فرار کی طرف لے جاتے ہیں جو کہ اسلام کا مقصود نہیں ہے۔ اسلام تو زمان و مکان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی تسخیر (الا بسلطان) پر ابھارتا ہے اس لیے شراب سے اجتناب (فاجتنبوہ - ۵:۹۰) رقص سے پرہیز (مرّوا باللغو مرّوا کراما ۲۵:۷۲) لازم قرار دیتا ہے اور کم سے کم نیند پر قناعت (قم اللیل الا قلیلا ۷۳:۲) کی ترغیب دلاتا ہے۔ شعور کے تناؤ کو قائم رکھ کر ہی ہم دنیا کی حقیقت تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں کیونکہ حقیقت کو سمجھ کر ہی اسے مسخر کیا جا سکتا ہے (ویتفکرون فی خلق السموات)۔ اور مرتی حقیقت کے خوف سے نجات (لا خوف علیہم ولا ہم یحزنون - ۳۸ : ۱۱) اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے جب ہم اشیاء میں علّت و معلول کے رشتے کو سمجھ کر ان میں سے زمان و مکاں کا جبر ختم کر دیں۔

اسی طرح "تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ" میں علّامہ اقبالؒ لکھتے ہیں[۵]:

" اسلام کو تو نفسیاتِ انسانی کی اس زبردست حقیقت کا بھی اعتراف ہے کہ ہماری یہ قدرت کہ آزادی اور اختیار سے جیسے چاہیں عمل کریں ہمیشہ یکساں نہیں رہتی۔ وہ کبھی بڑھتی رہتی ہے اور کبھی گھٹ جاتی ہے۔ لہٰذا اسلام چاہتا ہے کہ آزادی و اختیار کی یہ قدرت خودی کا ایک مستقل عنصر بن جائے۔ اوقاتِ صلوٰۃ کی تعیین بھی جو قرآن مجید کے نزدیک خودی کو زندگی اور اختیار کے حقیقی سرچشمے سے قریب تر لا کر اسے "اپنی ذات پر قابو" حاصل کرنے کا موقع دیتی ہے، اسی مقصد کے پیشِ نظر کی گئی ہے تاکہ ہم نیند اور کسبِ معاش کے میکانیت آفریں اثرات سے محفوظ رہیں۔ گویا صلوٰۃ سے اسلام کی غرض یہ بھی ہے کہ خودی میکانیت سے نکلے اور اس کی بجائے آزادی و اختیار حاصل کرے"

'سُکر' میں شعور اور عمل دونوں معطّل ہو جاتے ہیں جو کہ ایک طرح کی موت ہے جبکہ خودی کی زندگی وابستہ ہے خود شعوری اور عمل سے۔ لہٰذا بقائے دوام "بہ بحرش گم شدن" سے نہیں بلکہ "او را در گیری" سے ہی ممکن ہے۔ اسی لیے قرآنِ حکیم نیند (جس میں شعور معطّل ہوتا ہے) کو تشبیہ یا استعارہ کے معنوں میں ہی نہیں بلکہ حقیقی معنوں میں بھی، موت قرار دیتا ہے۔

اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِھَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِھَا ج فَیُمْسِکُ الَّتِیْ
قَضٰی عَلَیْھَا الْمَوْتَ وَیُرْسِلُ الْاُخْرٰی اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی ط (۳۹[۶] - ۴۲)

؎ من ترا اے بے خبر از زندگی وادم نشاں — خواب را مرگِ سبک داں، مرگ را خوابِ گراں (اقبالؒ)

---

[۶] "وہ اللہ ہی جو موت کے وقت روحیں قبض کرتا ہے اور جو ابھی نہیں مرا ہے اس کی روح نیند میں قبض کر لیتا ہے۔ پھر جس پر وہ موت کا فیصلہ نافذ کرتا ہے اُسے روک لیتا ہے اور دوسروں کی روحیں ایک وقت مقرر کے لیے واپس کر دیتا ہے۔"

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مشکوٰۃ کی ایک حدیث ہے" النوم اُخت الموت (نیند موت کی بہن ہے)۔ سونے اور جاگنے کے وقت کی مسنون دعائیں بھی اسی حقیقت کی غماز ہیں کہ نیند اور موت کی حقیقت ایک سی ہے۔ مثلاً سونے کے وقت کی مسنون دعا کے الفاظ ہیں:

اَللّٰھُمَّ باسمك اَمُوتُ واحیي (بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی)" اے اللہ تیرے نام کے ساتھ میں سوتا اور بیدار ہوتا ہوں"۔

اسی طرح جاگنے کے وقت جو دعا مانگی جاتی ہے اس کے الفاظ یوں ہیں: الحمد للہ الذی احیانا بعد ما اماتنا والیہ النشور (بخاری، ابوداؤد، نسائی) "تمام تعریفیں اُسی ذات کے لیے ہیں جس نے ہمیں مارنے (نیند) کے بعد زندہ (بیدار) کیا اور اسی کی طرف ہم حاضر ہونے والے ہیں"۔

ان توضیحات سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اسلام میں انسان کی زندگی اور موت اس کے شعور کی کیفیات ہیں اور شعور کو مستقل بیدار رکھ کر ہی حیاتِ دوام حاصل ہو سکتی ہے۔ احادیث میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قلبِ مبارک نیند میں بیدار رہتا تھا اور یہ انسانی زندگی کا منتہائے کمال ہے۔ اسلام میں وہ تمام چیزیں ناپسندیدہ قرار دی گئی ہیں جو تعلق باللہ یعنی "خدا شعور خود شعوری" کی کیفیات میں حارج ہوں نیند، سُکر، شراب اور رقص چونکہ شعور کے تناؤ کو مضمحل کرتے ہیں[۱۵] اس لیے اسلام میں روحانی ترقی کے لیے شراب اور رقص سے کُلی اجتناب، سُکر سے مکمل پرہیز اور کم سے کم نیند پر اکتفا کرنا لوازماتِ تربیت میں داخل ہے۔ ایک مسنون دعا میں سکراتِ موت سے اسی لیے پناہ مانگی گئی ہے تاکہ بقائمی ہوش و حواس یعنی بیداریٔ قلب کے ساتھ خدا کو یاد کرتے ہوئے جان جان آفریں کے سپرد ہو۔

قرآن کی جس آیت کا ہم نے ابھی ابھی اوپر حوالہ دیا ہے اور جس کی رُو سے علامہ اقبال خواب کو مرگِ سبک اور موت کو خوابِ گراں قرار دیتے ہیں، حیات مابعد الموت کو سمجھنے میں بہت اہمیت رکھتی ہے۔ درحقیقت حیات بعد الموت کو سمجھنے کی کوئی قدرت یا کچھ استعداد ہمیں حاصل ہے تو وہ نیند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے علماء اور صوفیاء نے ہمیشہ عالمِ خواب کو اپنی توجہ اور مطالعہ کا خاص موضوع قرار دیا اور سورۂ زُمر کی اس آیۂ مبارکہ کو استدلالاتِ حیات بعد الموت میں بہت اہمیت دی۔ جو حقیقت اس آیت میں بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ موت کے وقت روحیں قبض کرتا ہے اور جو ابھی مرا نہیں ہے اس کی روح نیند میں قبض کر لیتا ہے، پھر جس پر وہ موت کا فیصلہ نافذ کر دیتا ہے اسے روک لیتا ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور دوسروں کی رُوحیں ایک وقتِ مقرر کے لیے بھیج دیتا ہے۔

عضویاتی نفسیات کی زبان میں نیند کی حالت میں روح کے قبض ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ادراک و احساس کے آلات معطّل ہو جاتے ہیں لیکن ان حسی آلات کے بغیر بھی ادراک اور احساس موجود رہتے ہیں اور اس کی خودی (یعنی خود شعوری) قائم رہتی ہے، کیونکہ حالتِ خواب میں بھی وہ اپنے جسم کو ہو بہو دیکھتا ہے جو کھاتا پیتا، دیکھتا سنتا، آتا جاتا اور چلتا پھرتا ہے۔ اس کے سامنے سُرور و انبساط، لطف و انبہاج کے سب سامان اور درد و کرب اور رنج و غم کی سبھی صورتیں موجود ہوتی ہیں جو حالتِ بیداری میں وہ اس مادی دنیا میں محسوس کرتا اور سامنے موجود پاتا ہے۔ خواب میں اگر اسے کوئی دکھ یا تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اسے پوری شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے اور اگر اسے کوئی لذّت و راحت ملتی ہے تو اس سے بھی پورا کیف و سُرور حاصل کرتا ہے۔ غرض یہ کہ عالمِ خواب کے روحانی عالم میں اس کی مسرت و خوشی اور رنج و غم اور عالمِ بیداری کے مادی عالم میں اس کی مسرت و خوشی اور رنج و غم میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔ پھر جس طرح حالتِ بیداری کی لذت و کلفت حالتِ خواب میں معدوم ہو جاتی ہے اسی طرح حالتِ خواب کی لذت و کلفت بیداری میں رخصت ہو جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خواب و بیداری دو عالم ہیں جن میں شعور کی زندگی اپنا تسلسل قائم رکھتی ہے بالکل اسی طرح زندگی اور موت ہر دو حالتوں میں سے گزرتے ہوئے شعور قائم و باقی رہے گا۔ بقول علاّمہ اقبال ؎

این ہم جہانے آں ہم جہانے | این بیکرانے آں بیکرانے
ہر دو خیالے، ہر دو گمانے | از شعلۂ من موجِ دُخانے
این یک دو آنے آں یک دو آنے | من جاودانے، من جاودانے
این کم عیارے آں کم عیارے | من پاک جانے نقد روانے
این جا مقامے آں جا مقامے | این جا زمانے آنجا زمانے
اینجا چہ کارم آنجا چہ کارم | آہے فغانے آہے فغانے
این رہزنِ من آں رہزنِ من | اینجا زیانے آنجا زیانے

ہر دو فروزم ہر دو بسوزم
این آشیانے آں آشیانے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہاں اس حقیقت کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ علامہ اقبالؒ کے نزدیک "شعور" یا "جان" یا "خودی" کو بنیادی حیثیت حاصل ہے جو مرکزِ وجود ہے اور "بدن" اس کی محض ایک عارضی کیفیت ہے۔ اِس حقیقت کو انہوں نے کئی مقامات پر مختلف الفاظ میں بیان کیا ہے ؎

با تو گویم رمز باریک اے پسر   تن ہمہ خاک است و جاں والا گہر
جسم را از بہر جاں باید گداخت   پاک را از خاک می باید شناخت
لیکن آں جانے کہ گردد جلوہ مست   گر ز دست او را دہی آید بدست
تا ز جاں بگذشت جانش جانِ اوست   ورنہ جانش یک دو دم مہمان اوست
ترا جوہر ہے نوری پاک ہے تُو   فروغِ دیدۂ افلاک ہے تُو

علامہ اقبالؒ کے نزدیک کائنات کی حقیقتِ آخری روحانی (شعوری) ہے اور اسے ایک خودی تصوّر کرنا چاہیے۔ اس کائناتی خودی نے، جسے مذہب کی زبان میں خدا کہا جاتا ہے، اپنے ارادہ اور امر سے اس کائنات کو پیدا کیا ہے[۵۲]، اور یہ امرِ ربی شعور کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ یوں دیکھا جائے تو یہ امرِ ربی ہی ہے جو انسانی جسم کو پیدا کر کے اس کے اندر خودی کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ ان معنوں میں یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ انسان کی خودی نے ہی انسان کے جسم کو پیدا کیا ہے ہمیں اپنی خودی کا تجربہ شعورِ ذات کے تسلسل سے ہوتا ہے اِس لیے قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان جواہر (ATOMS) میں جن سے ہمارا جسم ترکیب پاتا ہے شعور کہاں سے آ داخل ہوتا ہے۔ علامہ اقبالؒ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ شعور ہی وہ حقیقتِ اُولیٰ ہے جو ان جواہر کے اندر پہلے ہی موجود تھی اور شعور ہی سے ان کا وجود ہے۔ لہٰذا شعور کا تسلسل حیات بعد الموت پر بھی قائم رہتا ہے[۵۳]۔

تشکیلِ جدید میں خودی کی حیات بعد الموت پر ایک اور دلیل دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ خودی کا تعلق اگرچہ جسم سے ہے اور زمان و مکاں میں اس کا صدور اگرچہ جسمانی بنیاد پر ہوتا ہے یعنی کمتر خودیوں کی وہ بستی جن کا اجتماع اور عمل و تعامل جب ایک خاص نسق پر پہنچ جاتا ہے تو اس سے ایک ایسی اعلیٰ تر خودی (قرآن کے الفاظ میں خلقِ آخر) کا صدور ہوتا ہے جس کی رسائی جسمانی حدود و قیود سے ماوراء ہے۔ اس لیے اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ حیاتِ ذی روح کی اساس خالصتاً مادی اور طبیعی ہے تو بھی ان ماورائی خواص کی بنا پر جو شعوری سطح کی زندگی پر اس کے اندر پیدا ہو گئے ہیں یہ کہاں لازم آتا ہے کہ جس چیز کا صدور ہوا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ پھر اسی میں تحلیل ہو جائے گی جس سے اس کا ظہور اور نشوونما ہوتی۔ ارتقائے حیات پر نظر ہو تو یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ شروع شروع میں اگرچہ طبیعی کا نفسی پر غلبہ ہوتا ہے لیکن پھر جیسے جیسے نفسی طاقت حاصل کرتا ہے طبیعی پر چھا جاتا ہے۔ اس لیے یہ بھی عین ممکن ہے کہ آخر الامر اس سے آزاد ہو جائے۔ لہٰذا موت کا غم صرف اسی شخص کو لاحق ہو سکتا ہے جو نفسِ انسانی کے محیر العقول خواص سے صرف نظر کرتے ہوئے خودی کو جسم یعنی محض ایک پیکرِ خاکی سمجھتا ہو۔

نری نجات غمِ مرگ سے نہیں ممکن — کہ تو خودی کو سمجھتا ہے پیکرِ خاکی

یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق قرآن پاک فرماتا ہے:

فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى ۙ عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ ۭ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۙ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدٰى ۝ [۱] (النجم)

خویش را آدم اگر خاکی شمرد — نورِ یزداں در ضمیرِ او بمرد

بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ ۣ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا ۡ بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ ۝

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا وَّاٰبَاۗؤُنَآ اَىِٕنَّا لَمُخْرَجُوْنَ [۲] (النمل ۔ ۶۷)

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی — ہے یہ شامِ زندگی صبحِ دوامِ زندگی

درحقیقت یہ وہ غافل لوگ ہیں جو اپنے علم کی کمی کی بنا پر حقائق کا انکار کر رہے ہیں (بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ) اور آخرت کو چھوڑ کر اسی دنیا پر ریجھ رہے ہیں (اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ)۔ ایک حدیث میں ہے:

عن زرعة بن عبد الله ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال یحب الانسان الحیوۃ الدنیا

۱؎ پس اے نبی، جو شخص ہمارے ذکر سے منہ پھیرتا ہے اور دنیا کی زندگی کے سوا جسے کچھ مطلوب نہیں، اُسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ ان لوگوں کا مبلغ علم بس یہی کچھ ہے۔ یہ بات تیرا رب ہی زیادہ جانتا ہے کہ اُس کے راستے سے کون بھٹک گیا ہے اور کون سیدھے راستے پر ہے۔

۲؎ بلکہ آخرت کا تو علم ہی ان لوگوں سے گم ہو گیا ہے بلکہ یہ اس کی طرف سے شک میں ہیں، بلکہ یہ اُس سے اندھے ہیں۔ یہ منکرین کہتے ہیں کیا جب ہم اور ہمارے باپ دادا مٹی ہو چکے ہوں گے تو ہمیں واقعی قبروں سے نکالا جائے گا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

والموت خیر لنفسہ، اخرجہ البیہقی (زرعہ بن عبداللہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آدمی زندگی کو محبوب رکھتا ہے حالانکہ موت اس سے بہتر ہے)

از مرگ ترسی اے زندہ جاوید ‏ ‏ مرگ است صیدے تو در کمینی

چہ غم داری حیات دم زدم نیست ‏ ‏ کہ در دل حلقۂ بود و عدم نیست

مخور اے کم نظر اندیشۂ مرگ ‏ ‏ اگر دم رفت دل باقی است غم نیست

چنانچہ علامہ اقبالؒ کے نزدیک جسم کی حقیقت اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ احوالِ حیات میں سے ایک حال ہے۔

بجاں پوشیدہ رمز کائنات است ‏ ‏ بدن حالے ز احوالِ حیات است

علم حیاتیات میں جو حیرت انگیز انکشافات ہوئے ہیں ان سے یہ بات ثابت ہے کہ تین سال کی قلیل مدت میں جسم کے تمام خلیے ( ) مر مٹ جاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے خلیے لے لیتے ہیں لیکن احساسِ ذات کا تسلسل عمر بھر قائم رہتا ہے مثلاً ایک شخص زید سو سال کی عمر کو پہنچ کر بھی وہی زید رہتا ہے جو وہ کبھی تین سال کی عمر میں تھا اگرچہ حیاتی اعتبار سے وہ اس دوران تیس جسم بدل چکا ہوتا ہے ۔

ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود ‏ ‏ کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی ‏ ‏ فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

گُل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے ‏ ‏ اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے

لہٰذا جسم کی حقیقت اگر وجود کے ایک لباس سے زیادہ نہیں اور اس کی اصل حقیقت نوری (یعنی خود شعوری) ہے تو جسمانی موت اسے ختم نہیں کر سکتی ۔

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن میرا ‏ ‏ ترے وجود کے مرکز سے دُور رہتا ہے

لیکن یہاں یہ حقیقت پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ علامہ اقبال جسم اور رُوح کی ثنویت کے قائل نہیں ہیں۔ وہ جسم اور رُوح کی ثنویت کو سراسر ایک غیر اسلامی تصوّر سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک خودی یا وجود کی حقیقت ایک مرکزِ شعور ہے اور جسم محض اس کی ایک شان ہے ۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا حیات بعد الموت پر بھی کسی مادّی پیکر کی ضرورت ہو گی ؟ علامہ اقبالؒ کا خیال ہے کہ اگرچہ از رُوئے سائنس معادِ جسمانی بھی کوئی ناقابلِ فہم حقیقت نہیں ہے اور عین ممکن ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ انسان اسی بدن کے ساتھ پھر سے جی اٹھے۔ تاہم آپ کے نزدیک یہ بات کچھ زیادہ اہم نہیں کہ آیا انسان کو اگلی زندگی میں یہی جسم عطا ہوتا ہے یا کوئی نیا لطیف پیکر جس کے لیے شاہ ولی اللہ نے نسمہ کی اصطلاح استعمال کی ہے اور جس کے متعلق ان کا یہ خیال ہے کہ یہ بالکل براتے نام نہایت لطیف قسم کا بدن ہوگا۔ آخر عالم خواب میں بھی تو ایک نہایت ہی لطیف جسم یعنی مطیئتہ الروح کا تجربہ انسان کو ہوتا ہے۔ حیات بعد الموت ایک ایسی حقیقت ہے جس کا تجربہ اور ادراک اس دنیا میں ممکن ہی نہیں ہے اور اس بات کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے کہ جسم و جان کے موجودہ واحدہ میں سے کیا چیز باقی رہ جانے والی ہے اور موت کے بعد جسم و جان کا کیسا واحدہ تیار ہوگا کیونکہ قرآنِ حکیم نے صاف صاف الفاظ میں تبلا دیا ہے کہ انسان اپنی نشأۃ اولیٰ کا علم تو رکھتا ہے لیکن آخرت میں وہ کس حالت اور کس عالم میں اٹھایا جائے گا اس کا علم اسے حاصل نہیں ہو سکتا۔ البتہ اسے موجودہ زندگی کے تجربہ کے حاصل پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔

نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ وَنُنْشِئَكُمْ فِيْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰى فَلَوْلَا تَذَكَّرُوْنَ ○[1] (الواقعہ ۶۱:۶۲)

جس طرح ایک ایسا بچہ جو ابھی ماں کے پیٹ ہی میں ہے اس دنیا کی زندگی اور اس کے حقائق سے واقف نہیں ہو سکتا اسی طرح انسان بھی مرنے سے پہلے اپنی اُخروی حیات کے بارے میں واضح طور پر کچھ نہیں جان سکتا۔

عن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ما شبهت خروج ابن آدم من الدنیا کمثل خروج النبی من بطن امّه من ذالك و الی روح الدنیا اخرجه الحکیم (ترمذی)

"حضرت انس سے روایت ہے کہ رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا دنیا سے آدمی کے انتقال کرنے کو اس مثال کے مشابہ پاتا ہوں جیسے بچہ ماں کے پیٹ کی تنگی سے دنیا کی کشادگی میں آتا ہے"۔

---

[1] ہم نے تمہارے درمیان موت کو تقسیم کیا ہے اور ہم اس سے عاجز نہیں ہیں کہ تمہاری شکلیں بدل دیں اور کسی ایسی شکل میں تمہیں پیدا کر دیں جس کو تم نہیں جانتے۔ اپنی پہلی پیدائش کو تم جانتے ہو پھر کیوں سبق نہیں لیتے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زادنِ طفل از شکستِ اشکم است   زادنِ مرد از شکستِ عالم است

جس طرح ایک طفل کی ولادت شکست سے ہوتی ہے اسی طرح قیامت کے روز پورا طبعی عالم شکست ہو جانے پر آخرت کے انسان کی ولادت ہو گی۔ چنانچہ قرآنِ حکیم فرماتا ہے کہ ہم نے نہیں عبث نہیں بنایا اور نہ نہیں یونہی چھوڑ دیں گے۔ چنانچہ کفار کے اس جواب میں کہ جب انسان مٹی میں مل کر مٹی ہو جائے گا اس کے بعد اس کا جی اٹھنا بعید ہے۔ قرآنِ پاک فرماتا ہے:

قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ وَعِنْدَنَا كِتَابٌ حَفِيْظٌ (ق۔۴)

ہم جانتے ہیں کہ مٹی تمہارے وجود میں سے کس چیز کی کمی کر دیتی ہے۔ ہمارے پاس تمہارا وجودِ حقیقی محفوظ ہے، اب ہم نہیں زندہ کریں گے تو گذشتہ زندگی کی طرف رجعت نہیں ہو گی بلکہ خلقِ جدید کی طرف سبقت ہو گی۔ خودی جو منازل ایک بار طے کر چکی ہے وہ کبھی واپس نہیں آئیں گی۔ اب ایک نئے نقشہ پر زندگی مرتب ہو گی۔ جسم و جاں کا جو نیا واحدہ اب پیدا ہو گا وہ اپنے تمام گذشتہ ریکارڈ کو اپنے ساتھ لیے ایک نئی زندگی کا آغاز کریگا! اس نئی زندگی میں وہی خودی ثبات حاصل کر پائیگی جس نے اپنے آپ کو اس کے لیے تیار کیا ہے اور جو خودی اپنی تربیت اور حفظ و استحکام سے غافل رہی ہے اسے فنا کا خوف و غم لاحق رہے گا۔

(لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى)

یہاں "اقبال کے حضور میں" سے ایک اقتباس دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔ سید نذیر نیازی لکھتے ہیں:۔

"حیات بعد الموت پر گفتگو ہونے لگی، ارشاد ہوا "قرآن پاک میں ہے جسد عنصری فنا ہو جائے کوئی مضائقہ نہیں ہمیں خوب معلوم ہے کہ ضروری کیا ہے اور غیر ضروری کیا ہے؟

پھر فرمایا "خودی کے لیے شاید کوئی جسد ناگزیر ہے یا یہ کہنا بہتر ہو گا کہ ہمیں جسد کی بربادی کا غم نہیں ہونا چاہیے۔ پھر یہ ضروری کیا ہے اور غیر ضروری کیا؟ یہ ارشاد بڑا معنی خیز ہے بلکہ ایک راز — شاہ صاحب نے بھی تو جسد بعد الموت کے لیے نسمہ کی اصطلاح وضع کی ہے۔ ہندو ادب میں اسی طرح کا ایک لفظ (شریر) موجود ہے۔"

میں نے عرض کیا زندگی کے مادی شرائط تو مسلّم ہیں کہ ہم انہیں بہ یقین و اطمینان پورا کر سکتے ہیں مگر سوال ان نفسیاتی شرائط کا ہے کہ ہم کیسے کہیں کہ ہم نے انہیں پورا کر دیا ہے لہٰذا حیات بعد الموت میں ہمارا ایمان ہی اس معاملے میں ہمارا واحد سہارا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ارشاد ہوا "سہارا ہی نہیں راز بھی — لیکن شرط یہ ہے کہ ہم انبیاء علیہم السلام کی زندگی کو معیارِ عمل ٹھہرائیں"۔ میں نے کہا اسی لیے تو یہ کہنا مشکل ہے کہ اس معیار پر کون پورا اترا اور کون نہیں اترا۔ ہم اپنے متعلق تو دعویٰ سے کچھ بھی نہیں کہہ سکتے، یوں بھی دلوں کا حال کون جانتا ہے علیم و خبیر تو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ بعثتِ ثانیہ ضرور ہوگی اس لیے خودی کی تربیت اور عدمِ تربیت کا خیال ہی نہیں کرتے۔ کرتے ہیں تو جزا اور سزا کا، جیسے شرائط کا معاملہ سزا اور جزا سے وابستہ ہے نہ کہ حیات بعد الموت سے"۔

فرمایا "مذہب کی تعلیم بھی یہی ہے۔ حیات بعد الموت ایک یقینی امر ہے۔ با ایں ہمہ بقائے دوام ہمارا حق نہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل اور انعام ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اپنے آپ کو اس کے لیے تیار کریں"۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ علامہ اقبال حیات بعد الموت (RESURRECTION) اور بقائے دوام (IMMORTALITY) میں فرق کرتے تھے۔ حیات بعد الموت تو ہر ایک کے لیے ہے لیکن بقائے دوام صرف تربیت یافتہ خودیوں کا ہی مقدر ہے۔ موت و حیات خودی کے احوال ہیں۔ قرآن پاک فرماتا ہے: كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ۔ (البقرہ - ۲۸)

موت کے بعد زندگی اور زندگی کے بعد موت اور موت کے بعد پھر زندگی۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ اور یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ خودی کی آزمائش کی جائے۔

خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (الملک - ۲)

مقصدِ آزمائش یہ ہے کہ آیا خودی حُسنِ عمل یعنی اپنے تشخص اور انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے بقائے دوام کی مستحق ٹھہرتی ہے یا نہیں۔ فطرت کا تقاضا تو یہی ہے کہ خودی کا وجود ضائع نہ ہو کیونکہ علامہ اقبالؒ کے نزدیک خودی کی سب سے بڑی صفت اس کی یکتائی ہے اس لیے خودی نہ تو کسی دوسری خودی میں گم ہو سکتی ہے اور نہ ہی اس کا ظہور کسی دوسری خودی کے طور پر ہوتا ہے۔ ہر خودی کا ایک مستقبل ہے اس لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی تربیت اور حفظ و استحکام سے غافل نہ رہے کیونکہ اس سے ہر لحظہ فنا کی قوتوں کا اندیشہ بھی لاحق ہے۔ (۹۱ : ۱۰)

غرض علامہ اقبالؒ کے تصورِ حیات بعد الموت [illegible] کا طبعی تقاضا (یعنی حفظِ ذات کی خواہش)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور اخلاقی تقاضا (یعنی اعمال کی جزا و سزا) دونوں یکجا ہو گئے ہیں۔ حیات بعد الموت ایک یقینی امر ہے۔" اس لیے ہمیں اپنے اعمال کی جزا و سزا مل کر رہے گی اور یوں اخلاقی تقاضا پورا ہو گا۔" بایں ہمہ بقائے دوام (ہمارا حق) نہیں یہ اللہ تعالیٰ کا فضل و انعام ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اپنے آپ کو اس کے لیے تیار کریں۔" یہ زندگی کا ایک طبیعی تقاضا ہے اور غایتِ ارتقائے حیات۔

یہاں ایک آخری سوال رہ جاتا ہے کہ اگر موت کے بعد بھی متناہی خودی اپنا وجود لامتناہی خودی سے الگ تھلگ رکھے گی تو آخر ان کا آپس میں کیا تعلق ہے؟ اس موضوع پر "اقبال کے حضور میں" میں ایک دلچسپ بحث نقل کی گئی ہے۔

میں نے عرض کیا "لیکن یہ خودی کا وجود خدا سے الگ نہیں اور یہی کچھ شاید آپ کا ارشاد بھی ہے۔"

فرمایا "یہی تو ایک راز ہے جس کا پتہ نہیں چلتا۔"

میں نے عرض کیا "آپ کا ارشاد کیا اتصالِ بے تکیف، بے قیاس کی طرف ہے؟"

اتصالِ بے تکیف بے قیاس ہست رب الناس را با جان ناس (رومی)

اور جس کی رُو سے وحدت الوجود کی نفی ہو جاتی ہے۔ ذات باری تعالیٰ محیط بر کُل ہے لیکن وراء الورا، واحد اور لاشریک۔ لہٰذا وہ کیا تعلق ہے جو اسے مخلوق سے ہے اور جس کے بغیر مخلوق کی ہستی ممکن نہیں؟ پھر وہ ہماری رگِ جاں سے بھی زیادہ قریب ہے (۵۰-۱۶) انسان اور اس کے قلب کے درمیان حائل -۸ (الانفال، ۲۴)

فرمایا "ہاں"

میں ایک لحظہ کے لیے ٹھہر گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے حقیقتِ مطلقہ کے ادراک اور اس کے تعیّن کا ایک ذریعہ نکل آیا۔ یوں میرا ذہن اس مضمون کی طرف منتقل ہو گیا جو میں نے یوم اقبال کی تقریب پہ لکھا تھا۔ خودی کے لیے ہمیں خدا کو تلاش کرنا پڑے گا اور یہ محض رعایتِ لفظی کی بنا پہ نہیں بلکہ حضرت علامہ اقبال کے اس شعر کے پیشِ نظر:

از ہمہ کس کنارہ گیر صحبت آشنا طلب
ہم ز خدا خودی طلب ہم ز خودی خدا طلب

اس لیے میں نے عرض کیا "منطقی اعتبار سے یہ دلیل کیسی ہے؟ کیا خودی کے اثبات سے خدا کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اثبات لازم آتا ہے؟

فرمایا" یہ دلیل تو کچھ ایسی ہے جیسی متکلمین بالعموم پیش کیا کرتے ہیں اور جس کا رد "تنقید عقل محض" میں بخوبی ہو چکا ہے۔ ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ خودی ایک حقیقت ہے اگرچہ قائم بالذات کی تلاش لازم ٹھہرے گی۔

مَیں نے عرض کیا" خودی کے استحکام میں کیا خودی کا احساس بھی ضروری ہے؟

فرمایا" کیوں نہیں"۔

مَیں نے کہا" اگر ایسا ہے تو ان لوگوں کا انجام کیا ہو گا جن کو خودی کا احساس ہے نہ اس کے استحکام اور عدمِ استحکام سے مطلب؛ لہٰذا سوال یہ ہے ہم ابتدائی انسان کے بارے میں کیا رائے قائم کریں یا ان لوگوں کے بارے میں کیا کہیں جو خودی کے قائل نہیں؛ مثلاً ہمارا مادیت پرست یا یہی دنیادار طبقہ ہے جو حیاتِ دنیوی میں اس طرح کھو گیا ہے کہ ان حقائق کو خاطر ہی میں نہیں لاتا۔ وہ باوجود عقائدِ مذہبی کے ایک طرح سے مادیت پر ہی قانع ہے؛ کیا ان کے لیے بھی حیات بعد الموت خودی کے استحکام پر موقوف ہے؟"

ارشاد ہوا" بے شک"۔ پھر ذرا سکوت کے بعد فرمایا" تمہاری نظر اس حقیقت پر ہونی چاہیے کہ دنیا میں کوئی شے نہیں جسے حفظ ذات کی خواہش نہ ہو۔ رہی یہ بات کہ اس خواہش کا اظہار شعورِ ذات کے مختلف مراحل پر کس طرح ہوتا ہے یہ ایک الگ مسئلہ ہے جس سے یہاں بحث نہیں۔ حفظ ذات کی خواہش بہر حال اتنی عام ہے جتنی انسانیت بلکہ زندگی۔ لہٰذا بقائے دوام کا امکان ہر شخص کے لیے موجود ہے۔ اسلام عبارت ہے فطرت اللہ سے"۔ مَیں ابھی کچھ عرض نہیں کرنے پایا تھا کہ حضرت علامہ نے پاس ہی رکھے ہوئے تخت کی طرف اشارہ کیا۔ فرمایا" دیکھو تمہارے سامنے یہ تخت رکھا ہے۔ تم اسے اٹھانا چاہو تو نہیں اٹھے گا۔ لہٰذا ہم کہیں گے اس کا خاصہ ہی یہ ہے کہ اسے کوئی اٹھانا چاہے تو نہ اٹھے۔ بالفاظ دیگر اس کی مزاحمت کرے۔ لہٰذا اس کا نہ اٹھنا ہی اس کی فطرت ہے اور ہم کہیں گے اس کی یہ فطرت یعنی مزاحمت اس کا اسلام ہے۔ بعینہٖ زندگی کی بھی ایک فطرت ہے اور حفظِ ذات اس کا تقاضا"۔

مَیں نے عرض کیا" لیکن ہماری خودی قائم بالغیر ہے۔ ہم اپنے وجود کے لیے غیر کے محتاج ہیں لہٰذا ایک طرف حفظِ ذات کی خواہش ہے اور دوسری جانب فنا کا خوف"۔

ارشاد ہوا" یہ صحیح ہے لیکن اس طرح بقائے دوام (IMMORTALITY) کی نفی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تو نہیں ہوتی"۔

مَیں نے پھر کہا "یہ درست ہے لیکن اصُولاً خودی کو فانی ہی ٹھہرایا جائے گا۔ یہ دوسری بات ہے کہ بسبب اس تعلق کے جو ہمیں مطلق خودی سے ہے ہمارے لیے بقائے دوام کا امکان موجود ہے۔ بایں ہمہ اس کو کیا کہا جائے کہ ہمارا ذہن بارہا اس حقیقت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ جس طرح پیدائش سے پہلے خودی کا کوئی وجود نہ تھا (هَلْ أَتَىٰ عَلَى الْإِنسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُن شَيْئًا مَّذْكُورًا) بعینہٖ موت کے بعد اس کی ہستی شاید کالعدم ہو جاتی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔ (كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ اور كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ) کیا تصوّف میں اسی لیے خودی کو ایک پردہ نہیں ٹھہرایا گو آپ کا ارشاد اس کے خلاف ہے"۔

فرمایا "اسی لیے تو مَیں نے لکھا ہے کہ بقائے دوام ایک انعام ہے ہمارا حق نہیں۔ ہمیں چاہیے کہ اپنے آپ کو اس کے لیے تیار کریں"۔ (فنا کے خوف سے نجات اور حفظ ذات کی تیاری یہی ہے کہ متناہی خودی لامتناہی خودی کے ساتھ ایک پائیدار رشتہ محبت رکھتی ہو۔ اقبالؒ کے نزدیک یہ رشتہ کچھ ایسا رشتہ ہے جس میں لامتناہی خودی متناہی خودی سے ممیّز (DISTINCT) تو رہتی ہے لیکن اس سے منفصل (ISOLATED) نہیں ہوتی[56] یعنی 'وصال اندر فراق' والی کیفیت ہوتی ہے یہی محبت اور دردمندی خودی کی بقا کی ضامن ہے۔

اگر ما زندہ ایم از دردمندی　　　اگر پائندہ ایم از دردمندی

یہ محبت ہی ہے جو انسان کو ثبات و استمرار عطا کرتی ہے۔ اس دنیا میں بھی بقائے دوام کا تجربہ انسان کو عشق کے شدید لمحوں میں ہی میسّر آتا ہے۔

روزے کہ ذرّہ ذرّہ شود استخوانِ من　　　باشد ہنوز در دلِ ریشم ہوائے تو (خسرو)

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شُد بعشق　　　ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما (حافظ)

متناہی خودی کی لامتناہی خودی سے لازوال محبت چونکہ کبھی ختم ہونے والی نہیں اور لامتناہی خودی ابدی اور دوامی حقیقت ہے اس لیے اس کی آرزو اور تمنّا ہی اسے بھی غیر فانی بنا دے گی اقبالؒ کے نزدیک زندگی ایک بامقصد عمل ہے لہٰذا جو مقصد اپنی عظمت و کمال کی وجہ سے لامتناہی ہے اس کی طلب متناہی خودی کو ثباتِ دوام عطا کر دیگی ؎

آدم بمیرد از بے یقینی　　　جانے کہ بخشند دیگر نگیرند

خودی را از وجودِ حق وجودے　　　خودی را از نمودِ حق نمودے